باب اوّل

اُردو میں طنز و مزاح کی روایت

۱ - معنی و مفہوم

۲ - اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت

۳ - اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت

الف- افسانوی نثر میں طنز و مزاح

ب - غیر افسانوی نثر میں طنز و مزاح

Scanned with CamScanner

(باب اوّل)

اُردو میں طنز و مزاح کی روایت

خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے اور اس میں کچھ ایسی خصوصیات و دیعت کردی ہیں جو دوسرے جانداروں میں نہیں ہیں۔ نطق، جذبہ اور فکر، یہ عناصر دوسرے جانداروں میں نہیں پائے جاتے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا ہلکا سا پرتو کہیں کہیں نظر آ جائے۔ کہتے ہیں کہ جانور اپنی خاص بولی میں اظہار کرسکتے ہیں۔ گائے اپنے بچّے کیلئے محبت کا جذبہ رکھتی ہے۔ لیکن فکر یا سوچ سے جاندار عاری ہوتے ہیں۔ وہ کسی مسئلہ پر سوچ کر حل نہیں نکالتے بلکہ جبلّی طور پر مسئلہ کا حل خود بخود تلاش کرلیتے ہیں۔ جذبہ کے ساتھ ہنسی یا غم منسلک ہوتے ہیں۔ بعض جانور بھی اپنی خوشی کا اظہار کرسکتے ہیں۔ لیکن انسان خوشی کے اظہار کیلئے ہنسی کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ جس کے کئی درجے ہیں۔ جیسے زیرِ لب تبسّم، واضح تبسّم، قہقہہ، ہنسی وغیرہ۔ اِن درجوں کا تعلق اصل میں ہنسی کی Intensity سے ہے۔ انسان اِس وقت ہنستا ہے جب اِس کو کوئی عجیب اور مضحکہ خیز بات نظر آئے۔

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:۔

''ہنسی عموماً عدم تکمیل یا بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔''

(سُخنہائے گفتنی'' از کلیم الدین احمد صفحہ ۳۱۶)

یہ ضروری ہے کہ انسان بے ڈھنگے پن یا عدم تکمیل کو محسوس کرسکے یعنی ہنسنے کیلئے انسان میں فہم کا مادّہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

انور صدیقی نے اِس بات کو یوں لکھا ہے :

''اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اِس پر ہنستے ہیں۔ لیکن ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ پر گر پڑے تو باقی بھینسیں اِس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی۔'' (پطرس بخاری ایک تجزیہ از انور صدیقی صفحہ ۲)

Scanned with CamScanner

اگر کوئی شخص کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گر پڑتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ اِس کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ دوسرے اِس کو دیکھ کر رنج یا تعلق خاطر کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر گرنے والا شخص کیچڑ میں لت پت ہو جائے ۔مگر زخمی نہ ہو تو اِسے دیکھ کر شاید ہنسی آجائے۔

(ا) معنی و مفہوم :۔

مزاح یا ظرافت سے متعلق ڈاکٹر سنبل نگار اپنی تصنیف ''اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ'' میں اِسطرح رقم طراز ہیں :۔

''ہنسنا ہنسانا انسان کی فطرت ہے۔ ہنسی کے ذریعہ خوشی پھیلتی ہے۔ اِس لئے اِس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور ہنسانے کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ ادب کے ذریعہ ہنسانے کا فن ظرافت کہلایا۔''

(''اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ'' از ڈاکٹر سنبل نگار صفحہ ۲۳۴)

وہ آگے لکھتی ہیں :۔

''مزاح کسی خامی، کسی بدصورتی، کسی بے تکے پن پر خوش دلی سے ہنسنے کا نام ہے۔ اِس میں غم غصہ تلخی کا گذر نہیں۔ حصول مسرت کے سوا اِس کا کوئی اور مقصد نہیں۔'' (صفحہ ۲۳۵)

اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہنسی اور مزاح انسان کے اہم اوصاف میں سے ایک ہیں۔ ہنسی پیدا کرنے کیلئے کئی طرح کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِس تعلق سے ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:۔

''ہنسی کے کئی عوامل ہیں مثلاً میکانیکی نظام حیات اور یکسانیت کے خلاف ردّ عمل ۔ پریشانیوں سے وقتی نجات کی خواہش۔ نفسی توانائی کی حفاظت اور کفالت اور

اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کے درد کا شعوری اور لاشعوری احساس وغیرہ۔"

(اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت" مقدمہ از ڈاکٹر خالد محمود صفحہ ۱۱)

یہ ساری چیزیں انسان کے نفسیاتی نظام کو اِس طرح متحرک کرتی ہیں کہ وہ اپنی کمی کو ہنسی اور مزاح کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔

ادب اور مزاح کا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اسلوب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ برجستگی، سلاست، لہجہ کی شگفتگی، معنویت اور تفریح جیسی چیزیں مزاحیہ اظہار کو موثر بناتی ہیں۔ اِسی کا دوسرا رُخ طنز ہے اور یہ بھی ادب میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ طنز کی بنیاد ہجو، تنقیص، غضب، حقارت اور استہزاء ہے، جس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ صاحب اظہار اپنے دل کا غبار نکال سکے۔

تمسخر کی ایک وجہ نفرت بھی ہے۔ چنانچہ طنز نگار کے یہاں وہ باتیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جن سے طنز نگار نفرت کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے۔ یہ عناد ذاتی بھی ہوسکتا ہے اور پورا نظام اور سماجی اقدار بھی اِس کا نشانہ ہوسکتے ہیں۔ گویا طنز ایک طرح سے تنقید کا کام بھی کرتا ہے۔ طنز سے متعلق ڈاکٹر سنبل نگار کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں :-

"طنز با مقصد ہوتا ہے اور اصلاح اِس کا مدعا ہوتا ہے۔ طنز نگار کسی بدی کو اور زیادہ برا بنا کر اِسطرح پیش کرتا ہے کہ لوگ اِس بدی سے نفرت کرنے لگیں اور اُسے مٹانے کے درپے ہوجائیں۔ اِس لئے یہاں بہت شدت ہوتی ہے......طنز میں کاٹ ہوتی ہے۔ اِس میں ایک ڈنک چھپا ہوتا ہے جو چبھتا ہے اور تکلیف دیتا ہے۔"

("اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ" از ڈاکٹر سنبل نگار صفحہ ۲۳۵)

(۲) اُردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت :-

ادب کی شناخت شاعری اور نثر نگاری سے ہوتی ہے اور ہر زبان کے ادب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اِس میں سب سے پہلے شاعری کو فروغ حاصل ہوا اور اِس کے بعد نثر نگاری نے اپنے وجود کو منوایا۔ اِس نظریہ کا

Scanned with CamScanner

اطلاق نہ صرف اُردو شاعری پر ہوتا ہے۔ بلکہ اُردو نثر نگاری میں طنز و مزاح کی روایت پر بھی ہوتا ہے۔ اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو میں طنز و مزاح کی روایت بھی ابتداء میں شاعری کے ذریعہ فروغ پائی اور پھر رفتہ رفتہ نثر میں بھی طنز و مزاح کی مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کافی قدیم ہے۔ اِس تعلق سے ڈاکٹر سیدہ جعفر اپنی تصنیف ''تاریخ ادب اُردو'' جلد سوم میں لکھتی ہیں :-

''اُردو میں شمالی ہند میں اُردو ادب کے آغاز کے ساتھ ہی طنزیات و مضحکات کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے نام جعفر زٹلی کا ہے جن میں غیر معمولی تہذیبی شعور اور ثقافتی حیثیت موجود تھی۔ وہ ایک طرح سے اُردو کے پہلے شہر آشوب لکھنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیا تھا.........اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اُردو طنز و مزاح کی روایت کو پروان چڑھایا۔ انھوں نے سوداؔ کی مزاح نگاری کی راہ ہموار کی۔

(''تاریخ ادب اُردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک'' جلد سوم از ڈاکٹر سیدہ جعفر صفحہ ۳۲۱)

چنانچہ سوداؔ کے یہاں طنز و مزاح کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سوداؔ نے ہجویات لکھ کر طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا اہم جز بنایا۔ ان کا مشہور قصیدہ ''تضحیک روزگار'' بظاہر مزاح پر مبنی ہے لیکن اِس میں سوداؔ نے اپنے دور کے فوجی نظام پر طنز کیا تھا۔ سوداؔ کے بعد میر ضاحکؔ، انشاؔء، جراءتؔ اور رنگینؔ وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں کہیں کہیں مزاح کے طور کو اپنایا۔ اسی طرح دکن میں بھی عادل شاہی اور قطب شاہی شاعروں قطبیؔ اور غواصیؔ وغیرہ نے بھی اپنی شاعری میں مزاح کے طور کو اپنایا تھا۔ اسی طرح ہجو یہ قصیدوں اور شاعرانہ چشمکوں کے دوران لکھے جانے والے اشعار میں بھی طنز و مزاح کی روایت نظر آتی ہے۔ لکھنوء کے شاعروں نے ریختی گوئی کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو فروغ دیا۔ لیکن اِس شاعری میں ہنسی ٹھٹھول، پھکڑ پن اور عامیانہ پن غالب تھا۔ باضابطہ طنز و مزاح کے ذریعہ مقصدی شاعری کی روایت منشی سجاد حسین کے اخبار ''اودھ پنچ'' کے ذریعہ شروع ہوتی ہے۔ جس کے قلمکاروں نے مشرقی تہذیب اور اخلاق کی حمایت کی

Scanned with CamScanner

اور یورپی تہذیب کے علاوہ مغربی فیشن کے خلاف شاعری کو استعمال کر کے طنزیہ و مزاحیہ شعر گوئی کی روایات کو پروان چڑھایا۔ ''اودھ پنچ'' کے مزاح گو شاعروں کے قافلہ ء سالار اکبر حسین اکبرالہ آبادی تھے جنہوں نے طنزیہ و مزاحیہ شاعر کو مقصد کے طور پر استعمال کیا۔ اِن کے علاوہ مچھو بیگ، ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، سید محمد آزاد، عبدالغفار شہباز، احمد علی شوق، اور جوالا پرشاد برق جیسے مزاح گو شعراء ''اودھ پنچ'' کے حلقہ میں شامل تھے ۔

(۳) اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت :۔

اُردو کا پہلا دستیاب نثری کارنامہ ''سب رس'' مانا جاتا ہے۔ جس میں ملّا وجہی نے کہیں کہیں ایک دو لفظوں کے استعمال یا قافیہ پیمائی سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے ''صاحب بی بی غلام''، ''مصری بادام'' پھر طویل داستانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ روایت فارسی کے توسط سے اُردو میں داخل ہوئی اور بیشتر فارسی داستانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں داستانیں محفلوں میں سنائی جاتی تھیں۔ اور داستان گو کیلئے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ سامعین کی دلچسپی برقرار رکھنے کیلئے کہیں کہیں مزاح سے بھی کام لے۔ چنانچہ ''داستان امیر حمزہ''، ''داستان طلسم ہوشربا'' اور ''داستان الف لیلہ'' وغیرہ میں جابجا عیاروں کی کارگزاری سامعین کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ خصوصاً عمر عیار کا کردار جو اپنی مثال آپ تھا۔

داستانوں کے بعد اُردو میں ناول نگاری جیسی نذیر صنف کا آغاز ہوا اور ڈپٹی نذیر احمد نے تمثیلی قصہ لکھ کر اُردو میں ناول کو روشناس کرایا۔ ناول نگاری میں بھی طنز و مزاح کے عناصر دیکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ عناصر غالب رجحان کی صورت میں نہیں ہوتے۔ بلکہ قصہ کے ذیلی روپ میں اپنا اثر دِکھاتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُردو ناول نگاری میں طنز و مزاح کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح ''ابن الوقت'' ناول میں بھی طنز و مزاح کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے مکمل طور پر ناول میں طنز و مزاح پیش کرنے والے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ جنھوں نے اُردو کے ضخیم ناول ''فسانہ آزاد'' میں دو ایسے اہم کردار

Scanned with CamScanner

پیش کئے جن کے ذریعہ ناول میں طنز ومزاح کے فروغ کا احساس ہونے لگتا ہے۔اس ناول میں ''میاں خوجی'' اور ''میاں آزاد'' کے کردار واضح طور پر نثر میں طنز ومزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

غرض اُردو نثر میں طنز ومزاح کا باضابطہ آغاز ہونے سے قبل داستانوں اور ناولوں میں طنز ومزاح کی روایت ثبوت ملتا ہے جس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اُردو نثر میں طنز ومزاح کو ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کی روایات سے قبل بھی طنز ومزاح کو اظہار کے طور پر استعمال کرنے کی خصوصیت موجود تھی۔ چنانچہ ''اودھ پنچ'' نے طنز ومزاح کو ہی بنیاد بنایا۔اس طرح سے یہ پہلا اخبار ہے جس کے ذریعے طنز ومزاح کو فروغ حاصل ہوا۔

(الف) افسانوی نثر میں طنز ومزاح :۔

اُردو نثر کے تحقیقی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں افسانوی نثر داستانوں کی شکل میں تھی۔ جس کے بعد ناول کی صنف وجود میں آئی۔ پھر رفتہ رفتہ افسانے کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔اس کے بعد ڈرامہ اور ناولٹ جیسی اصناف بھی منظر عام پر آئیں۔اُردو کی طبع زاد داستانوں اور ترجمہ شدہ داستانوں میں اگر طنز ومزاح سے بھرپور کردار یا اظہار کے دوران طنز ومزاح کی خصوصیت دِکھائی دیتی ہے۔تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف یا داستان گو قصے کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔اور اسی لئے اس میں کبھی مضحک کردار اور کبھی واقعات کے ذریعہ طنز وظرافت کے عناصر پیدا کئے جاتے تھے۔ چنانچہ خواجہ عمرو اور ان کے چیلوں کے کرداروں میں جہاں عیاری اپنا اثر دکھاتی ہے۔وہیں ہنسنے ہنسانے کی روایت کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔اٹھارویں صدی عیسوی کا تمام تر دور داستانوی دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اس دور میں بے شمار داستانیں ترجمہ کی گئیں۔اس عہد میں چونکہ ادب کا مقصد ہی دل بہلانا تھا اسلئے اس دور کی نثر میں طنز ومزاح کو شامل کیا گیا۔اُردو نثر کی داستانوں میں کوئی بھی داستان ایسی نہیں کہی جاسکتی جسے ہم مزاحیہ داستان کہہ سکیں البتہ بے شمار داستانوں میں طنزیہ ومزاحیہ عناصر کی شمولیت دِکھائی دیتی ہے۔

داستانوں کے بعد افسانوی نثر میں ناول کو فروغ حاصل ہوا۔ڈپٹی نذیر احمد،عبدالحلیم شرؔر مرزا محمد ہادی رسوؔا، پنڈت رتن ناتھ سرشاؔر وغیرہ نے ناول کے فروغ میں حصہ لیا۔ناولوں میں بھی خیالی دنیا آباد تھی لیکن ان کے قصے

Scanned with CamScanner

داستانوں کی طرح مافوق الفطرت عناصر اور جادوئی طاقتوں کے حامل نہیں تھے بلکہ ان میں انسانی معاشرے کی زندگی کو اُجاگر کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے آغاز کے ساتھ ہی داستانوں پر زوال آ گیا اور وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی گئیں اور ان کی جگہ ناولوں نے اپنے وجود کو منوالیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اولین تمثیلی قصہ ''مراۃ العروس'' سے لیکر عبدالحلیم شرر کے ناولوں تک طنز ومزاح کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

ناول کے توسط سے طنز ومزاح کو سب سے پہلے ارادی طور پر استعمال کرنے والے ادیبوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا شمار ہوتا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف اپنے شہرہ آفاق ناول ''فسانہء آزاد'' میں طنز ومزاح کو نمایاں کیا بلکہ اپنے دوسرے ناولوں ''کرم دھرم'' اور ''پی کہاں'' کے توسط سے بھی اس وقت کے ماحول اور معاشرے میں ایک ایسی روایت کو جنم دیا جو افسانوی نثر میں طنز ومزاح کی روایت کو نمایاں کرنے کی ضامن بن گئی۔ مُنشی سجاد حسین نے بہترین ظریفانہ ادب تخلیق کیا۔ اس ضمن میں ''طرحدار لونڈی'' ''حاجی بغلول'' اور ''احمق الذین'' ان کی بہترین تصانیف ہیں۔ انھوں نے جب ۱۸۷۷ء میں لکھنو سے ''اودھ پنچ'' اخبار جاری کیا تو طنز ومزاح کے ایک تابناک دور کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس اخبار نے اکتیس (۳۱) برس تک اُردو ادب کی خدمات انجام دی اور طنز ومزاح کا بہترین سرمایہ فراہم کیا۔ اس نے متعدد اہم ظرافت نگار پیدا کئے جن میں اکبر الہ آبادی، محمود علی بدایونی، تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمنڈوی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے بعد سلطان حیدر جوش، مولانا ظفر علی خاں، مہدی افادی، امتیاز علی تاج، قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی قابل ذکر ہیں اور پھر ظرافت کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ اور ان کے ہم عصروں کا دور ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ سے قبل اُردو دُنیا میں شوکت تھانوی نے طنزیہ ومزاحیہ ناول لکھنے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی۔

داستان اور ناول کے بعد بیسویں صدی کی ابتداء میں افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ حاصل ہوا اور سجاد حیدر یلدرم کے علاوہ منشی پریم چند نے اُردو میں جس قسم کی افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ دیا وہ سماجی مسائل کی پیشکشی تھی۔ بیشتر افسانہ نگاروں نے اسی روش کو اختیار کرنے کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کی اس کے علاوہ رومانی تحریک

Scanned with CamScanner

کے زیر اثر جو افسانے لکھے گئے ان میں خواب ناک فضاء کو اہمیت دی گئی۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک بھی طنزیہ و مزاحیہ افسانہ کی روایت نظر نہیں آتی۔ اُردو نثر میں مرزا عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی طنز و مزاح نگاری کی وجہ سے نہ صرف افسانوی نثر رفتہ رفتہ طنز وظرافت سے مالا مال ہوئی بلکہ غیر افسانوی نثر میں بھی اس روش کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

مزاح نگاری اُردو ڈرامہ کا بھی جز رہی ہے۔ اُردو کا مشہور ڈرامہ ''گوپی چند جالندھر'' ہو یا ''اِندر سبھا'' ان میں کہیں کہیں مزاح کے عناصر چنگاریوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ سید امتیاز علی تاؔج اور پھر ان کے بعد آغا حشؔر کاشمیری نے ڈرامے لکھے تو ان ڈراموں کا طرز و انداز اگرچہ سنجیدگی کی طرف مائل رہا لیکن کہیں کہیں مزاحیہ جملے اور مزاحیہ کردار شامل کئے گئے تاکہ ناظرین کی دلچسپی کا سامان مہیا ہو سکے یہی طریقہ فلموں میں بھی استعمال کیا گیا اور مرکزی کرداروں کے ساتھ کچھ مسخرے قسم کے کردار بھی شامل کئے گئے کچھ ایسی ہی صورتِ حال سرکس کی بھی ہے جس میں جوکروں کے ذریعہ مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد تفریح کے علاوہ یہ بھی تھا کہ جوکروں کی مسخری حرکات میں ناظرین محو ہو جائیں اور دوسرے پروگرام کے انتظامات بہ آسانی ہو سکیں۔

ہندوستان میں ریڈیو کی ایجاد اور ریڈیو پروگراموں کی کثرت کی وجہ سے ریڈیائی ڈراموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیشتر طنز و مزاح نگار ریڈیو سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ریڈیو ڈراموں کی شکل میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ جہاں سنجیدہ ڈرامے نشر کئے جانے لگے وہیں طنزیہ اور مزاحیہ ڈرامے بھی نشر کئے جانے لگے۔ جب احمد شاہ بخاری پطرس اور سجاؔد حیدر یلدرؔم ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تو ان کی شگفتہ گوئی کے نتیجہ میں ریڈیو ڈرامہ کے توط سے طنزیہ و مزاحیہ ڈراموں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ بے شمار سنجیدہ ناویل نگاروں اور افسانہ نگاروں نے بھی ریڈیو کیلئے طنزیہ اور مزاحیہ ڈرامے تحریر کئے۔ چنانچہ جہاں محمد فضل الرحمٰن، مرزا ادیب، پروفیسر محمد مجیب اور دوسرے مشہور ڈرامہ نگار سنجیدہ ڈرامہ کی روایت کو فروغ دے رہے تھے وہیں شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، شکیل الرحمٰن اور دوسرے ادیبوں نے طنزیہ اور مزاحیہ ڈراموں کو فروغ دیا۔ اس طرح اُردو کی افسانوی نثر میں ڈرامہ بھی ایک ایسی صنف ہے جو طنز و مزاح کی روایت کو

Scanned with CamScanner

فروغ دینے کا وسیلہ بن گیا۔

افسانوی نثر میں ناولٹ ایک جدید ترین صنف ہے اور اس صنف کو ترقی پسند تحریک کے توسط سے فروغ حاصل ہوا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا عہد ۱۹۴۷ء تک کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کے عہد میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور افسانوی نثر کو بھی فروغ حاصل ہو چکا تھا اور ناولٹ بھی اس دور میں وجود میں آ چکا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند نثر نگاروں نے ناولٹ کی صنف کو مسائل کی پیشکش سے وابستہ کیا۔ ''ادب برائے زندگی'' کے نظریہ نے بھی ناولٹ کی صنف کو کافی متاثر کیا لیکن اسی دور میں شوکت تھانوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لال کپور نے طنزیہ و مزاحیہ قصّے لکھ کر ناولٹ کو دلچسپ بنا دیا۔ بیک وقت افسانہ، ڈرامہ اور ناولٹ میں مزاح نگاری کو فروغ دینے والی ادیبہ کی حیثیت سے ڈاکٹر رشید جہاں کا مقام و مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ وہ علی گڑھ کی ایک ایسی ادیبہ تھیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی طنز و مزاح نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

شوکت تھانوی نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے علاوہ ناول بھی لکھے جن کے اختصار کی وجہ سے شاید انھیں ناولٹ بھی کہا جا سکے۔ ''داماد'' ''پگلی'' ''بہروپیا'' اور ان کے کئی ناول ہیں جو زیادہ طویل نہیں ہیں لیکن ان سب کو ناول ہی کہا گیا ہے۔ اسی طرح کنہیا لال کپور نے ''برج بانو'' جیسا انشائیہ لکھ کر ''اُردو'' کو ایک کردار کی حیثیت دے دی۔ گویا طنزیہ اور مزاحیہ افسانوں اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ ناولٹ بھی اُردو نثر میں مزاحیہ اسلوب کے ضمن میں ایک اہم صنف بن گیا۔ جس عہد میں مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ذریعہ اُردو نثر کے گیسو سنوار رہے تھے اس عہد میں حیدر آباد دکن کے طنزیہ و مزاحیہ ناول نگار ابراہیم جلیس نے طویل اور مختصر طنزیہ و مزاحیہ ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ان کے مشہور ناولٹ ''چالیس کروڑ بھکاری'' اور ''دو ملک ایک کہانی'' کو اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کہ انھوں نے فکشن کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ کے عہد میں ہی طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی تھی۔

Scanned with CamScanner

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ ایک ایسے عہد کے طنز و مزاح نگار ہیں جب (جس وقت) طنز و مزاح کی پذیرائی کی جانے لگی تھی۔ اس وقت تک اُردو افسانوی نثر کی اضاف میں طنز و مزاح کے نقوش واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے۔ چنانچہ آج کا اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا سرمایہ انتہائی وقیع ہو چکا ہے اور آج کا ادیب اُردو نثر میں طنزیہ و مزاحیہ ناول، افسانہ، ڈرامہ۔ اور ناولٹ لکھنے کی طرف مائل ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ طنز و ظرافت نے افسانوی نثر کی تمام اضاف کو اپنے روّیہ سے حد درجہ متاثر کیا ہے۔

(ب) غیر افسانوی نثر میں طنز و مزاح:

قصہ، کہانی کی روایت کو فروغ دینے والی نثر بنیادی طور پر افسانوی نثر کہلاتی ہے جب کہ دنیا اور زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرنے والی نثر غیر افسانوی نثر کا درجہ رکھتی ہے۔ افسانوی نثر میں صرف چار اضاف یعنی داستان، ناول / ناولٹ افسانہ اور ڈرامہ کا شمار ہوتا ہے اس کے برخلاف دنیا کی حقیقتوں کو نمایاں کرنے والی نثر کی طرف توجہ دی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کی غیر افسانوی نثر کے اصناف کی طویل فہرست ہے اور اس طویل فہرست میں سب سے پہلے تذکرہ نگاری کی روایت ہے۔ میر تقی میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' کو اُردو کا پہلا تذکرہ قرار دیا جاتا ہے جو ۱۷۵۲ء میں تحریر کیا گیا۔ تذکرے کے بعد اُردو کی غیر افسانوی نثر میں جس صنف کو فروغ حاصل ہوا وہ ''سفر نامہ'' کی روایت ہے۔ محمد یوسف کمبل پوش نے ۱۸۴۷ء میں عجائبات فرنگ تحریر کیا جسے اُردو کے پہلے سفر نامہ کا درجہ حاصل ہے۔ تذکرہ اور سفر نامہ کے بعد اُردو کی غیر افسانوی نثر میں مکتوب نگاری کو اہمیت حاصل ہے چنانچہ ''مرزا غالب کے خطوط کے مجموعے ''اردوئے معلیٰ'' اور ''عودِ ہندی'' کو پہلے مطبوعہ خطوط کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیق کے مطابق مرزا غالبؔ نے ۱۸۴۶ء میں سب سے پہلا خط لکھا تھا۔ اس طرح تذکرہ اور سفر نامہ کے بعد خطوط نگاری کو اُردو کی تیسری اہم غیر افسانوی نثر کا درجہ حاصل ہے۔

انشائیہ نگاری کے ابتدائی نقوش ''سب رس'' میں ملتے ہیں۔ پروفیسر جاوید وشِشٹ نے ''سب رس'' میں کئی انشائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ بعض اہلِ قلم کا خیال ہے سرسید کی تحریروں کے ذریعہ انشائیہ نگاری کا آغاز ہوا اور ماسٹر

Scanned with CamScanner

رام چندر نے اُردو میں ''مضمون نگاری'' کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ''آپ بیتی نگاری'' جیسی صنف کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ''خودنوشت سوانح نگاری'' کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح نثر میں، انشائیہ نگاری، مضمون نگاری، آپ بیتی نگاری اور خونوشت سوانح نگاری جیسی غیر افسانوی اصناف کی طرف توجہ دی گئی۔ سرسید کے عہد میں ہی ''دیباچہ نگاری'' ''تبصرہ نگاری'' اور ''مقدمہ نگاری'' جیسی غیر افسانوی اصناف کیلئے بھی راہیں ہموار ہوئیں۔ اسی عہد میں تنقید نگاری اور ''تحقیق'' جیسی اصناف کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' علامہ شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ اور عبدالرحمٰن بجنوری نے ''محاسن کلام غالبؔ'' لکھ کر تنقیدی روّیہ کی راہیں ہموار کیں۔ اُردو ادب جب بیسویں صدی میں داخل ہوا تو غیر افسانوی نثر میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ''رپورتاژ نگاری'' کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہ تمام اصناف غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کرتی ہیں اور اِن اصناف میں بجاطور پر سنجیدگی کا غلبہ رہا ہے، لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے غیر افسانوی نثر بھی طنزیہ و مزاحیہ اظہار

Scanned with CamScanner

کی حامل ہوگئی تھی۔ اگر چہ اُردو نثر میں طنزیہ و مزاحیہ تذکروں کی روایت نظر نہیں آتی لیکن شاعروں کی معاصرانہ چشمک کا ذکر تذکروں میں موجود ہے۔ جس سے طنز و مزاح کی روایت کا تذکرہ نگاری میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرے ''نکات الشعراء'' میں ولیؔ اورنگ آبادی کے حالات لکھے اور ولیؔ کی شہرت کا ذکر کرنا چاہا تو انھوں نے یہ فقرہ بطور خاص تحریر کیا۔ ''ولے شاعر ایست از شیطان مشہور تر'' یہ فقرہ جہاں ولیؔ کی شہرت کی عکاسی کرتا ہے وہیں میر تقی میرؔ کی ظرافت نگاری پر بھی دلالت کرتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تذکروں میں بھی اگر چہ سنجیدگی کو روا رکھا جاتا تھا لیکن کہیں کہیں طنز و مزاح کے عناصر بھی اپنا اثر دکھاتے تھے۔ ''آبِ حیات'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزادؔ نے شاعروں کے سوانحی حالات درج کرنے کے دوران بے شمار مقامات پر حاشیہ آرائی کی ہے اور اصل حقائق کے بجائے ایسا پُر لطف انداز اختیار کیا ہے کہ جس کی وجہ سے اِن کی اِس تذکرے میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاحیہ انداز کی بھی کارفرمائی ہے۔ اِس لئے بلاشبہ اُردو کے تذکروں میں طنز و مزاح کی تلاش ممکن ہے اور غیر افسانوی نثر یعنی تذکروں میں کہیں نہ کہیں طنز و مزاح کی کارفرمائی اپنا اثر دکھاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ''سفر نامہ'' (Travelogue) جیسی غیر افسانوی صنف کا آغاز سنجیدہ نثر کی حیثیت سے ہوا اور یہ صنف سر سید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزادؔ اور علامہ شبلیؔ نعمانی کے توسط سے سنجیدگی سے وابستہ رہی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی عہد میں بھی سفر نامے لکھے جاتے رہے، لیکن دورِ حاضر میں طنزیہ و مزاحیہ سفرناموں کی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ ابن انشاء کے سفر نامہ ''دُنیا گول ہے'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو نثر میں سفر نامہ کی روایت سنجیدگی سے نکل کر طنزیہ و مزاحیہ نثر سے وابستہ ہوگئی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے بھی ''جاپان چلو جاپان چلو'' لکھ کر طنزیہ و مزاحیہ سفر نامہ کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اِس طرح غیر افسانوی نثر میں سفر نامہ ماضی میں سنجیدگی سے وابستہ رہا، لیکن دورِ حاضر میں وہ طنز و مزاح کی روایت کے ساتھ اپنی وابستگی کو اٹوٹ بناتا جا رہا ہے۔

مکتوب نویسی میں غالبؔ کی اہمیت سے اُردو کا ہر طالب علم واقف ہے۔ انھوں نے خط کو مکالمہ بنادیا۔ غالبؔ کے خطوط اِس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی خطوط نویسی کے دوران سنجیدہ طبعی کے ساتھ ساتھ

طنز وظرافت کی پھلجھڑیوں کو بھی دور رکھا۔ غالبؔ کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ مزاح کی موجودگی کی وجہ سے ہی انہیں ''حیوان ظریف'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غرض ''خطوطِ غالبؔ'' میں طنز ومزاح کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ منشی سجاد حسین نے اپنا اخبار ''اودھ پنچ'' شائع کیا تو اِس سے وابستہ بے شمار ادیبوں نے طنزیہ ومزاحیہ خطوط لکھ غیرافسانوی نثر میں طنز وظرافت کو شامل کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے عہد سے ہی طنزیہ ومزاحیہ خطوط لکھنے کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا اور اُردو کی غیرافسانوی نثر ایسے خطوط سے مالا مال ہو رہی تھی۔ اِسی عہد میں کئی طنزیہ ومزاحیہ رسالوں کا اجراءعمل میں آیا، جن میں طنزیہ ومزاحیہ خطوط شائع ہوتے رہے۔ اِس عہد میں ''ساقی''، ''نقوش''، ''نقد ونظر''، ''نکھارِ ادب'' اور ''تحریر'' جیسے رسالوں نے اپنے طنز ومزاح نمبر شائع کئے جسکی وجہ سے غیرافسانوی طنزیہ ومزاحیہ نثر کو فروغ کیلئے مواقع فراہم ہو گئے اور اِن رسالوں میں موجود خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ خطوط لکھنے کی روایت بھی اِس عہد میں کافی فروغ پا چکی تھی۔

ہر دور میں غیرافسانوی نثر کے توسط سے اظہار کی قوت کو تقویت دی جاتی رہی جس کے نتیجہ میں نثر میں کئی اصناف کا اضافہ ہوا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ جس انداز کی نثر کو فروغ دیا، اِس میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کا انداز بھی کارفرما ہے۔ لطافت اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ تحریف نگاری کی وجہ سے نثر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اُردو کے نثری ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اُردو کا نثری سرمایہ چند اصناف تک محدود تھا۔ ابتداء میں افسانوی نثر صرف داستانوں تک وابستہ تھی، جبکہ غیرافسانوی نثر میں تذکرہ نگاری، سفرنامہ، مکتوب نگاری اور مضمون نگاری کی روایت ترقی کے مراحل طئے کر رہی تھی۔ اِس دور تک افسانوی اور غیرافسانوی نثر کا تصور عام نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی نویں دہائی کے دوران بھی جب اُردو کے محققین تحقیقی کارنامے انجام دیتے رہے تو اُنھوں نے نثر اور شاعری کو ان کی عین فطرت کے مطابق درجہ بندی نہیں کی۔ چنانچہ وزیر آغا نے جب اپنا تحقیقی مقالہ ''اُردو ادب میں طنز ومزاح''، تحریر کیا جس کی متعدد مرتبہ اشاعت ہو چکی ہے تو اِس مقالہ میں بھی اُردو شاعری اور نثر میں طنز ومزاح

کے دوابواب شامل کیئے گئے ہیں، لیکن فاضل مقالہ نگار نے اُردو نثر کو افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے متعارف نہیں کروایا۔ وہ اپنے مقالہ میں ایک ذیلی باب کی حیثیت سے ''قدیم اُردو داستانوں میں مزاح کے عناصر'' کا عنوان متعین کرتے ہیں تو دوسرا ذیلی باب ''غالبؔ کے خطوط'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔ جو اِس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے نثر کو افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں تقسیم نہیں کیا۔

غالبؔ کے خطوط بنیادی ورثہ کا درجہ رکھتے ہیں جن کے ذریعہ نہ صرف اُردو کی فطری نثر کی نمائندگی ہوئی بلکہ اِس کے ساتھ ہی طنز و ظرافت کے مختلف انداز بھی نمایاں ہونے لگے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''خطوط غالبؔ کی مزاح نگاری'' کے نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اِس طرح رقم طراز ہیں :۔

> ''اِن خطوط کے پس پشت ان یاس انگیز کیفیات سے کسے انکار ہوسکتا ہے جو غالب کی زندگی پر کثیف و غلیظ بادلوں کی طرح مسلط رہیں، لیکن اِسے مرزا غالب کی فطری خوش مزاجی کا ادنیٰ کرشمہ کہیئے کہ انھوں نے کہیں بھی اِس یاس کو اپنی ذات پر پوری طرح مسلط ہونے نہیں دیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اِن کے خطوط میں فریاد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی یا ایک تیز قسم کی طنز جنم لے لیتی لیکن وہ ہلکا ہلکا مزاح پیدا نہ ہوسکتا جو اِن خطوط کی جان ہے۔

> خطوط میں مزاح نگاری کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بہت کم نشانہ تمسخر بنایا۔ بلکہ زیادہ تر اپنے آپ ہی پر ہنستے رہے۔ مرزا اعلاؤالدین کی طرف مندرجہ بالا خط اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح رام پور سے واپسی پر یہ لکھنا کہ ''میں اپنے گھر پر مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں۔'' اِس بات پر دال ہے کہ اِس خط کا لکھنے والا کوئی معمولی انسان نہیں۔ عام لوگوں کیلیئے زندگی پر اِس قدر سنجیدگی مسلط ہے اور وہ کائنات میں اپنی ذات کو اِس قدر اہم اور ضروری خیال کرتے ہیں کہ

اِن میں خود کو مذاق کا نشانہ بنانے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوسکتی۔

فی الحقیقت خود پر ہنسنے کیلئے وسیع القلبی کی ضرورت ہے اور قدرت نے غالبؔ کو اِس کا بہت بڑا حصہ بخشا تھا۔

(''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' ترمیم شدہ ایڈیشن از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۶۷)

خطوطِ غالبؔ میں بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ ایسی مخصوص فضاء تیار کی ہے جس سے مزاح نگاری کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ غالبؔ کی نثر میں استعارہ، ذو معنی الفاظ، تجنیس اور تجاہل عارفانہ کے ذریعہ مزاح کی تعمیر ہوتی ہے۔ اِس خاص انداز سے مزاح کی خصوصیت اور کیفیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی زبان اور اِن کے اندازِ بیان میں موجود تخلیقی حسّیت بھی مزاح کے انداز کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ بہترین طنز و مزاح کو فروغ دیا ہے۔ چونکہ خطوط کا تعلق غیر افسانوی نثر سے ہے اِسلئے یہ صنف غالبؔ کے توسط سے فروغ پاتی ہوئی دورِ حاضر میں داخل ہوتی ہے۔

غیر افسانوی نثر میں مضمون نگاری کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ماسٹر رام چندر نے دلّی کالج کے توسط سے اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ وہ سنجیدہ مضمون نگاری کے بانی تصوّر کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخی و سائنسی مضامین کی طرف بھی توجہ دی۔ ماسٹر رام چندر کے بعد اُردو میں مضمون نگاری کی روایت کو بلندی تک پہنچانے اور اِس صنف کو ایک نئے انداز سے روشناس کرانے والے قلمکاروں میں سر سید کا شمار ہوتا ہے۔ جنھوں نے اُردو نثر میں مضمون نگاری کی صنف کو اِس قدر پروان چڑھایا کہ اِن کے مضامین حقیقت سے آشنا ہوکر مضمون نگاری کی سرحد کو پار کر جاتے ہیں اور اُردو نثر میں ایک نئی صنف کا اضافہ کر جاتے ہیں جو ''انشائیہ'' کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ مضمون اور انشائیے کی صنفی حیثیت سے اجتناب برتتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دینی ضروری ہے کہ بلاشبہ مضمون اور انشائیہ دو الگ الگ انداز کے اصناف ہیں اور انھیں ایک طرز کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ رسالہ

Scanned with CamScanner

''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے اُردو نثر کو فطری اسلوب سے وابستہ کیا۔ ان کی تحریریں مکمل طور پر سنجیدگی سے وابستہ تھیں۔ انھوں نے اپنے مضامین اور انشائیوں کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی مکمل کوشش کی۔ سرسید کے مضامین، انشائیوں اور خطوط میں موجود غیر افسانوی انداز کے تعلق سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں :۔

''سید موصوف اپنے زمانے کے صاحب طرز انشاء پرواز تھے اور انھوں نے اُردو نثر کے شگفتہ، سلیس اور ہر قسم کے مطالب کے اظہار کے قابل بنانے میں بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔

ان کے وہ خطوط پڑھیں جو انھوں نے لندن سے تحریر کئے یا اِن مضامین کا مطالعہ کریں جو ''تہذیب الاخلاق'' کے پرچوں کی زینت بنے تو ہمیں الفاظ کی پس پشت ایک نا قابلِ بیان عزم کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ قوم کو قعر و مذلّت سے اُٹھا کر بامِ ثریا تک پہنچانے کے اِس عزم نے ان کی نگارشات میں سنجیدگی کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور اِسی لئے اِن کی نثر میں غالبؔ کی سی لطافت یا رنگینی موجود نہیں۔ تاہم بعض بعض خطوط میں مزاح کی ایک ہلکی سے رو ضرور نظر آتی ہے۔ مثلاً جب وہ لندن سے اپنے مکتوب میں گردن مروڑی مرغی کا ذکر کرتے ہیں تو اِن کا زہر خند صاف نظر آ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات سنجیدہ باتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ہونٹ از خود تبسّم میں بھیگتے چلے جاتے ہیں۔ مولوی سید مہدی علی کے نام جو خطوط ہیں اِن میں یہ کیفیت بڑی نمایاں ہے، لیکن علی گڑھ کے زمانے کے خطوط میں سنجیدگی نے نورِ ظرافت کی اِس اُبھرتی ہوئی شعاع کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ پس اُردو نثر میں مزاح نگاری کا جائزہ لیتے وقت جب مولوی نذیر احمد یا سرسید احمد خاں کے نام ہمارے سامنے آ جاتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِن کی مزاحیہ صلاحیتوں کا اِن کے مقصد کی سنجیدگی نے قلع قمع کر دیا اور یہ اچھا ہوا یا برا اِس کا تو تاریخ ہی فیصلہ کرے گی۔ البتہ طنز و مزاح کے اِس طالب علم کو اِس بات کا افسوس ضرور ہے۔'' (''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۲)

ڈاکٹر وزیر آغا نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون نگاری کے توسط سے سرسید کی سنجیدہ طبعی کے پس منظر میں اِن کے مزاحیہ صلاحیتوں کے فقدان پر جس افسردگی کا اظہار کیا ہے اِس پر صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر شخصیت اپنے فطری اسلوب کی پروردہ ہوتی ہے۔ سرسید کو سنجیدہ مضامین اور انشائیہ نگاری کے توسط سے جو مقام ومرتبہ حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے سرسید کے اسلوب کی طرف دھیان نہیں دیا۔ سرسید کا ایک انشائیہ ''بحث وتکرار'' ہے۔ جس میں انھوں نے ایک نہایت سنجیدہ موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کیلئے آغاز میں مزاح کا سہارا لیا اور کتوں کے بھونکنے اور چیخ وپکار سے پیدا ہونے والی کیفیت کو نہایت ہی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ''اودھ پنچ'' نے مضمون نگاری کے جس رویہ کو اختیار کیا، اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مزاح نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ مرزا غالبؔ کے بعد غیر افسانوی نثر میں طنز ومزاح کی روایت کو فروغ دینے والے ادیبوں میں ''اودھ پنچ'' کے قلمکاروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا چنانچہ اس تعلق سے پنڈت برج نرائن چکبستؔ نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:۔

> ''اودھ پنچ کی ظریفوں کی شوخ وطرّار طبیعت کا رنگ غالب سے کہیں مختلف ہے۔ اِن کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم اِن تیروں کا نشانہ ہوتا ہے، وہ روتا ہے، اور دیکھنے والے اِس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔'' (''مضامین چکبست'' از پنڈت برج نرائن چکبستؔ صفحہ ۹۶)

چکبستؔ نے ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں کے تعلق سے جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ اپنی جگہ نہ صرف درست ہے بلکہ اِس حقیقت کی بھی نمائندگی کرتا ہے کہ سرسید کی سنجیدہ طرز نگارش کے مقابلے میں ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں نے وہ طرز اسلوب اختیار کیا جس کے باعث اُردو ادب، طنز وظرافت کی خصوصیت سے مالا مال ہوگیا۔ ''اودھ پنچ'' کے قلمکاروں نے مضمون نگاری کی روایت کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اِن کی مضمون نگاری، طنز ومزاح کی روایت کو فروغ دینے کا وسیلہ بن گئی۔ چنانچہ ''اودھ پنچ'' کی طنز وظرافت سے بھرپور مضمون نگاری کو بنیادی حیثیت کا درجہ دیتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

> ''اگر اِس وقت کی سوسائٹی کو مدِ نظر رکھ کر ''اودھ پنچ'' کے علمبرداروں کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی اِس اخبار نے اُردو زبان میں پہلی بار ایک بھرپور طنزیہ انداز اختیار کیا۔ اور ایک ایسے وقت میں جب کہ زندگی میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا ہورہی تھیں، فضاء کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔''

(''اُردو ادب میں طنز ومزاح'' از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۳)

Scanned with CamScanner

''اودھ پنچ'' کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اپنے اخبار کیلئے طنز و مزاح کی ایک کہکشاں سجائی تھی اور اس کہکشاں میں موجود مضمون نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرشاد برق، تربھون ناتھ ہجرؔ، احمد علی شوق کسمنڈوی اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر رزّاق فاروقی نے جب اپنا مقالہ ''اودھ پنچ کی ادبی خدمات'' تحریر کیا تو انھوں نے اپنے اس مقالہ میں اودھ پنچ سے وابستہ بارہ مضمون نگاروں کے ناموں اور اِن کے کارناموں کی وضاحت کی۔ اِسی طرح پروفیسر سیدہ جعفر نے ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک) تصنیف کی تو اِس میں انھوں نے جن طنز و مزاح نگاروں کے نام تحریر کئے اِن میں منشی سجاد حسین۔ مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرشاد برقؔ، سید محمد آزاد اور تربھون ناتھ ہجرؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بہر حال ''اودھ پنچ'' نے مزاح نگاروں کی سرپرستی کی اور اِس سے وابستہ نثر نگاروں نے اُردو نثر میں غیر افسانوی نثر کی ایک اہم صنف یعنی مضمون نگاری کو طنز و ظرافت سے وابستہ کر کے اِس صنف کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ درحقیقت ''اودھ پنچ'' کے مضمون نگاروں نے اُردو نثر میں طنز و ظرافت کا مزاج پیدا کیا اور اِن کے توسط سے ہی اُردو نثر کے طنز و مزاح نگاروں کا قافلہ رواں دواں ہے۔

''اودھ پنچ'' اکتیس سال تک جاری رہا اور اِس اخبار کے ذریعہ مضمون لکھنے والے ادیبوں نے مغربی تقلید اور فیشن پرستی کے علاوہ مغربی غیر فطری طریقوں کو نشانہ بناتے ہوئے سرسید کی مخالفت کا روّیہ اختیار کیا۔ لیکن اِس مخالفت کا مقصد اختلاف کو ہوا دینا نہیں تھا، بلکہ مشرقیت سے محبت اور مغربی اصول وطریقۂ کار کے خلاف احتجاج کو منظم کرنا تھا۔ اِس اعتبار سے ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں نے ایشیائی مزاج کو فروغ دینے کی کوشش کی اور اِن کے مضامین کا مقصد بھی طرز کہن پر اڑنا نہیں بلکہ اپنی روایت سے استفادہ کرنا اور اِن پر فخر کرنا تھا۔ غرض ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں کے توسط سے اُردو میں طنزیہ ومزاحیہ مضمون نگاری کا آغاز ہوا اور اِس روایت کی ترقی کا سلسلہ دراز ہوا۔

Scanned with CamScanner

اُردو کی طنزیہ ومزاحیہ ادب میں مرزا فرحت اللہ بیگ ایک مضمون نگار، خاکہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے مکمل طور پر غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کی اور اپنی سنجیدہ طبعی کو برقرار رکھتے ہوئے ہنسنے ہنسانے کے عمل کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اِن کے مضامین کے مجموعے ''مضامین فرحت'' کے نام سے ''عبدالحق اکیڈیمی'' حیدر آباد دکن کے زیرِ اہتمام سات جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اِن مضامین میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، اِن کے مضامین کی فہرست طویل ہے جو انھوں نے موقع بہ موقع لکھے۔ اُردو کی خاکہ نگاری کی تعریف میں اوّلین خاکہ نگاری کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام سب سے بلند ہے۔ اگرچہ انھوں نے ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ اِن کی زبانی'' لکھ کر خاکہ نگاری کی بنیاد کر رکھی اور اِس تصنیف کے ذریعہ خاکہ نگاری کی روایت کو فروغ دیا، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ انھوں نے طنز و مزاح کو بھی اِس میں شامل کرتے ہوئے ایک طرف یادداشت کی روایت کو فروغ دیا تو دوسری جانب مولوی نذیر احمد کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے دوران سوانحی خطوط کو بھی ابھارا۔ مولانا حالیؔ نے ''حیات سعدیؔ''، ''یادگارِ غالبؔ'' اور ''حیات جاوید'' کے توسط سے اُردو میں سوانحی ادب کی بنیاد رکھی تھی، لیکن اِن سوانحی تصانیف میں سنجیدہ سوانح نگاری کا عکس کافی نمایاں تھا، اِس کے برخلاف مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی تصنیف ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی ۔۔۔۔۔ کے توسط سے اُردو ادب میں مزاحیہ سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ جن کی نظیر غیر افسانوی اُردو نثر میں ملنی مشکل ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُردو نثر میں کن کن اصناف کی نمائندگی کی اِس موضوع پر بحث اگلے ابواب میں کی جائے گی لیکن چوں کہ مقالہ کے پہلے باب میں ''اُردو میں طنز و مزاح کی روایت'' سے بحث کی جا رہی ہے، اِسلئے یہاں اُردو کے افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں طنزیہ ومزاحیہ روایت کو بیان کیا گیا ہے۔ اُردو نثر میں مرزا الم نشرح کے قلمی نام سے نثر نگاری کا آغاز کرنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لئے طنز و مزاح کا ایسا روّیہ اختیار کیا جو اِن کی شناخت کا وسیلہ بن گیا اور وہ اُردو کے اِن ادیبوں میں شمار کئے جانے لگے۔ جنھوں نے اُردو نثر کو طنز و مزاح کی روایت سے وابستہ کیا۔ جب سارے ہندوستان میں اُردو والوں پر افتاد آ چکی تھی اور مسلم معاشرے میں جو افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا تو اِسے دور کرنے کیلئے اگر کوئی وسیلہ ادب کے توسط سے اختیار کیا جا سکتا تھا تو بلاشبہ اِس وسیلہ کو مزاح نگاری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُردو نثر کے توسط سے طنز و مزاح کو اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنے عہد کے اُردو ادب میں تبدیلی پیدا کی۔ ''اودھ پنچ'' کے ادیبوں نے طنز و مزاح کے توسط سے

Scanned with CamScanner

پھکڑ پن کو نثر میں رواج دیا تھا۔ جس میں توازن پیدا کرتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایسا باوقار انداز اختیار کیا کہ جس کی وجہ سے اِن کی تحریروں کو اعتبار کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے عہد کے ایک لطیف طنز نگار اور ایک شگفتہ مزاح نگار ہیں۔ جنکی نثر فطری طنز و مزاح پیش کرتے ہوئے سماج و معاشرے کی بے اعتدالیوں پر افسردگی کا اظہار کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی نثر کے توسط سے سماج کی ناہمواریوں اور غیر سماجی حرکات کو بنیاد بنایا۔ اُردو نثر جو ''اودھ پنچ'' کے توسط سے رفتہ رفتہ صرف ہنسی مذاق اور پھبتی کا وسیلہ ہنستی جا رہی تھی۔ اِسے سلجھا ہوا مذاق اور طنز و ظرافت سے وابستہ کرنے والے ادیبوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بہر حال مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُردو نثر کی روایت میں ہنسی ٹھٹھول اور پھکڑ پن کے بڑھتے ہوئے تسلط کو روکتے ہوئے نہ صرف ''اودھ پنچ'' کے نثر نگاروں کے غیر متوازن اسلوب پر قدغن لگائی بلکہ ایسے اسلوب کا انتخاب کیا، جسکی وجہ سے طنز و مزاح شرافت اور معتبری کا وسیلہ بن کر ظاہر ہوا۔ چنانچہ اسی خصوصیت کی وجہ سے اُردو ادب کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی انفرادی شناخت کے ذریعہ سرِ منفرد کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد احمد شاہ بخاری پطرس، مرزا عظیم بیگ چغتائی، مولانا ابوالکلام آزاد، امتیاز علی تاج، شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور کرشن چندر وغیرہ نے بھی طنزیہ و مزاحیہ اُردو نثر میں شہرت حاصل کی۔ اِسی طرح غلام احمد فرقت کاکوروی اپنی تصانیف ''مداوا''، ''قند مکرّر'' اور ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' کی وجہ سے اُردو طنز و مزاح میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین دورِ حاضر کی طنز و مزاح کی نمائندہ اہم شخصیتیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ

(۱)

جناب مولوی صاحب قبلہ!

یہ درویشِ گوشہ نشیں، جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے مکرمتِ حال کا شاکر اور آئندہ افزائشِ عنایت کا طالب ہے۔ "دفترِ بے مثال" کو عطیۂ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ سمجھ کر یادآوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچمیرز، ہیچمدان کو قابلِ خطاب اور لائقِ عطائے کتاب جانا۔

میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ دیوانِ فیض عنوان اسم بامسمی ہے۔ "دفترِ بے مثال" اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔ ہم فقیر لوگ اعلانِ کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں۔ شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ اُن سے بڑھ کر بہ صیغۂ مبالغہ، بے مبالغہ نسّاخ ہیں۔ تم دانائے رموزِ اردو زبان ہو۔ سرمایۂ نازشِ قلمروِ ہندستان ہو۔

خاکسار نے ابتدائے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اور اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثرِ فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندستان میں رہتا ہوں مگر تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت کچھ بکا، اب نہ فارسی کی فکر، نہ اردو کا ذکر، نہ دنیا میں توقع، نہ عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور

اندوہ ناکامی جاوید، جیسا کہ خود ایک قصیدہ و نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں :

چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من

ز آیندہ ناامیدم و ز رفتہ شرمسار

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا، اب اور کہاں تک رہوں گا ؟ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا ؟ مدح کا صلہ نہ ملا۔ غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ بہ قول طالب آملی علیہ الرحمۃ :

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی

دہن بر چہرہ زخمے بود : بہ شد

سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزہ، سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ اسی قدر ہے کہ معرضِ گفتار میں مطابقِ سوال، جواب دیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں کیا پیش آتا ہے، اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیوں کر بخشا جاتا ہے۔

حضرت سے یہ التماس ہے کہ آپ جو اہدا کے بادی اور مجھ گوار سال نامے کی سبیل کے بادی ہوئے ہیں، جب تک میں جیتا ہوں، نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے مرنے کے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا۔ والسلام بالوف الاحترام۔

۱۸۶۴ء

خط - ۲۳

قلعہ احمد نگر

۱۵۔ جون ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

عرب کے فلسفی ابوالعلاء معری نے زمانہ کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا۔ کل جو گزر چکا۔ آج جو گذر رہا ہے۔ کل جو آنے والا ہے۔

۱ ثلاثة ایام، ھی الدھر کلہ
وماھن، الا امس والیوم والغد

وما القمر الا واحد غیرانہ
یغیب ویاتی بالضیاء المجدد ۴۲۷

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسر ہے۔ وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے یا مستقبل کی، اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے، جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ماضی" اور "مستقبل" کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، اور ادھر اُس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں۔ لیکن خود "حال" کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیتا جس وقت کا ہم نے پیچھا کرنا چاہا تھا۔ وہ

Scanned with CamScanner

"حال" تھا، اور ہماری پکڑ میں آیا ہے وہ "ماضی" ہے۔

۲ نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

شاید یہی وجہ ہے کہ ابوطالب کلیم کو انسانی زندگی کی پوری مدت دو دن سے زیادہ نظر نہیں آئی:

۳ بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش
واں ہم کلیم با تو بگویم، چساں گزشت

یک روز صرف بستنِ دل شد بہ این و آں
روزے دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت ۳۲۸؎

ایک عرب شاعر نے یہی مطلب زیادہ ایجاز و بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

ومنی بما عدنا الوصال و دھرنا
یومان، یوم لوئ ویوم صدود ۳۲۹؎

اور اگر حقیقتِ حال کو اور زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر امید و بیم میں گزری، رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔ لم یلبثو الا عشیة او ضحاھا[۴۱]۔

۵ شورے شد واز خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ، غنودیم ۳۳۰؎

لیکن پھر غور کیجیے۔ اسی ایک صبح شام کے بسر کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے، کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے؟ کتنے سمندروں کو لانگنا پڑتا ہے؟ کتنی چوٹیوں پر سے کودنا پڑتا ہے؟ پھر آتش و پنبہ کا افسانہ ہے۔ برق و خرمن کی کہانی ہے۔

۶ دریں چمن کہ ہوا داغ شبنم آرائی ست
تسلئے بہ ہزار اضطراب می بافند، ۳۳۱؎

حواشی

۱۔ ابوالعلاء المعری کا قطعہ ہے (دیکھیے، شروح سقط الزند: ۳:۱:۱۳۵۰)

۲۔ مصحفی کا مصرع ہے (جواہر سخن (۲): ۶۳۹) پورا شعر ٹھیک یوں ہے:

سراغ قافلۂ اشک لیجے کیونکر
نکل گیا ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے

اس سلسلے میں دیکھیے خط (۲) حاشیہ (۱)

۳۔ دیوان کلیم: ۱۴۰۔ پہلے شعر کا مصرع ثانی یوں ہے:

گو ییم کلیم! با تو کہ آنہم چساں گذشت

دوسرے شعر میں 'زین و آں' کی جگہ 'از جہاں' ہے۔

۴۔ سورۃ النازعات ۷۹: ۳۶

۵۔ غزالی مشہدی کا شعر ہے (منتخب التواریخ، ۳: ۱۷۱؛ نیز طبقات اکبری، ۲: ۴۸۴؛ آئین اکبری (ص ۱۹۶) میں مصرع یوں ہے:

شورے شدہ، از خواب عدم چشم کشودیم

بدایونی نے مصرع اولیٰ میں 'چشم' کی جگہ 'دیدہ' لکھا ہے، اور یہی بہتر ہے۔

۶۔ کلیات بیدل (۱): ۶۱۰

☆☆☆☆☆

اشعار کا ترجمہ

۱/۳۲۷۔ زمانہ فقط تین دنوں پر مشتمل ہے گزرا ہوا کل۔ آج اور آنے والا کل۔

۲/۳۲۷ چاند بھی ایک ہی ہے وہ صرف غائب ہوتا ہے اور پھر ایک نئی روشنی لیکر طلوع ہوتا ہے۔

۱/۳۲۸۔ زندگی کی بدنامی دو دن سے زیادہ نہیں ہے اے کلیم ہم تجھ سے کیسے کہیں ہم نے ان کو بھی کیسے گزارا۔

۲/۳۲۸۔ ایک دن تو دل کو اِدھر اُدھر لگانے میں صرف ہو گیا اور دوسرا اِدھر اُدھر سے اکھاڑنے کی نظر ہو گیا۔

۳۲۹۔ ہمیں وصال محبوب کب میسّر ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارا زمانہ دو دنوں پر مشتمل ہے ایک جدائی کا دن اور ایک رکاوٹ (وصل محبوب میں) کا دن۔

۳۳۰۔ ایک شور اٹھا اور ہم نے خواب عدم سے آنکھ کھولی دیکھا کہ ابھی فتنہ کی کچھ رات باقی ہے پھر ہم سو گئے۔

۳۳۱۔ اس چمن میں ہوا شبنم کے جو داغ بنا رہی ہے وہ در حقیقت اسے ہزار پریشانیوں سے سکون بخش رہی ہے۔

منٹو

دبلا ڈیل، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بے قرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سُرخ چُہچہاتی ٹائی، ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ یہ کوئی چوبیں پچیس سال اُدھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلف، تیز طرار، چرب زبان۔ بولا۔ —"میں منٹو ہوں، سعادت حسن۔ آپ نے ہمایوں کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔"

پہلی ہی مُلاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اُس کا پانی اُتارنے کے لئے پوچھا "آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟"

بولا "نہیں!"

میں نے کہا "تو پھر آپ کیا کرسکیں گے؟"

منٹو نے کہا "انگریزی سے ترجمہ کرکے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈٹ کروں گا۔"

میں نے کہا "اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر ساقی کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔"

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اُس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھ پر واضح کرگیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاوضہ بھیج کر اُس سے منگایا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اس کی کتاب "سرگزشتِ اسیر" چھپ کر آئی تھی۔ منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور اس کے چند مضامین ساقی میں چھپے بھی، مگر قلبی تعلقات اس سے قائم نہ ہو سکے۔ مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے۔ بیخ خورا اور چھچھورا سا آدمی ہے۔ اس میں "میں" سما گئی ہے۔ زمانے کی چھری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمیونسٹ ہے اور مسلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ تم کو دق ہے۔ علی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرت سر چلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے نالاں تھے، اس لئے اُن سے بھی بگاڑ ہو گیا تھا۔ امرت سر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر "کمپنی کی حکومت" والے باری (علیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دبے دبے سے رہے، اس لئے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے۔ پھر باری رنگون چلے گئے، اور منٹو بمبئی جاکر اخبار "مصور" میں نوکر ہو گیا۔

کئی سال گزر گئے۔ منٹو سے ایک آدھ ملاقات اور ہوئی۔ مگر دل کی جواری اُن سے اب بھی نہ کھلی۔ جیسا اور بہت سے مضمون نگاروں سے تعلق تھا اُن سے بھی رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلی ریڈیو میں آگئے۔ اور اب جو اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

بولے "معاوضہ میں اس لئے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔"

دلی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے۔ خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر اختر حسین

رلے بوری، پروگرام کے شعبے میں ن م ۔ راشد ۔ انصار ناصری، محمود نظامی اور کرشن چندر۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشک اور اردو کے منٹو اور میراجی تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائیٹر خرید لئے۔ ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اردو کا ٹائپ رائیٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمے جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل چھوڑ ہی دیا تھا، کاغذ ٹائپ رائیٹر پر چڑھایا۔ اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، مگر منٹو کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ ___

"لو یہ رہا تمہارا فیچر!"

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی جچی تلی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی اس میں گنجائش نہ ہوتی۔

دلّی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دَورِ جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبعزاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کئے۔ ساقی کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ "دھواں" اسی ریلے میں لکھا گیا، اور اس کی اشاعت پر دلّی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا "بھائی، ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ بُرا ہے۔" بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا۔ حسبِ عادت بہت بگڑا۔ مگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

لیکن یہ ناسور دلّی میں بند ہوا تو لاہور میں پھوٹا اور "بُو" پر حکومتِ پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلّی سے بلوایا تھا۔ عدالت ۔۔۔ تو تا ۔۔۔

rekhta

Scanned with CamScanner

نہ ہو سکی۔ لیکن اپیل میں غالباً منٹو بری ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوف بھی منٹو کے دل سے نکل گیا، اور انہوں نے دھڑلے سے "فحش" مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ حکومتِ پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودہری محمد حسین ایک عجیب و غریب بزرگ تھے۔ تھے تو علامہ اقبالؒ کے حاشیہ نشینوں میں سے۔ مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبال کو اقبال میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کرا دیئے۔ پھر ان کا نشۂ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر ہم بھی دلی سے ملزموں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے میں جرمانہ قائم رہا۔ ورنہ اپیل میں سب بری ہوتے رہے اور چودہری صاحب کلستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی روداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کتاب کو چودہری صاحب ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں، اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات پر اڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ ان کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ ان سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ ان کا مرض بقول ان کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا دق ہے۔ کوئی کہتا معدے کی خرابی ہے کوئی کہتا جگر کا فعل کم ہو گیا ہے۔ اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انتڑیاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پروا ہو کر ساری بدپرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر "فراڈ" کا لفظ بہت چڑھا ہوا تھا۔ میراجی کے ہاتھ میں دو لوہے کے

گوے رہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا' ان کا مصرف کیا ہے؟ منٹو نے کہا' فراڈ' ہے ۔۔۔ میراجی نے سیویوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ منٹو نے کہا" فراڈ" ۔۔۔ اوپندر ناتھ اشک نے کوئی چیز لکھی، منٹو نے کہا فراڈ ہے۔ اُس نے کچھ چیں چپیں کی تو کہا" تو خود ایک فراڈ ہے"۔

یادش بخیر! ایک صاحب تھے دیوندر ستیارتھی۔ تھے کیا، اب بھی ہیں اور اردو اور ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں وہ دلی آئے تو انہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چرّایا ۔۔۔ خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے تھے۔ بھاری بھرکم۔ قد آور آدمی' چہرے پر بہت زبردست ڈاڑھی۔ دراصل انہوں نے اپنی وضع قطع ٹیگور سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصویر بھی کھچوائی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا" گرو اور چیلا"۔ ایک طرف سفید بگلا استاد اور دوسری طرف کالا بھجنگ شاگرد۔

ہاں تو ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کئے۔ ابتدا میں تو سب نے لحاظ مروت میں چند افسانے سُنے پھر کنی کاٹنے لگے۔ پھر انہیں دُور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سُنا۔ اس کے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھر لیا۔ منٹو نے برملا کہنا شروع کر دیا" تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تیری ڈاڑھی ڈاڑھی نہیں ہے' پراپیگنڈا ہے۔ تو افسانے ہم سے ٹھیک کراتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے"۔ اور اس کے بعد مغلظات سنانا شروع کر دیں۔ مگر صاحب' مجال ہے کہ ستیارتھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔ میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا۔" یہ راسپوٹین ہے' ابلیس ہے!"

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی۔ خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی

نہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا، بلکہ منٹو بد تمیزی کی حد تک مُنہ پھٹ تھا۔

ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا: "دیکھو منٹو، میں تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔"

منٹو نے جھلا کر کہا: "مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا!"

مزہ تو اُس وقت آیا جب چراغ حسن حسرت سے منٹو کی ٹکر ہوئی۔ واقعہ دلی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا رعب سب پر گانٹھتے تھے۔ ذکر تھا سومرسٹ ماہم کا جو منٹو کا محبوب افسانہ نگار تھا اور مولانا جھٹ بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میں لے آئے اور لگے اپنے چڑاونے انداز میں کہنے "مقاماتِ حریری میں لکھا ــــ آپ نے تو کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب۔" "دیوانِ حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا ــــ مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے۔" اور حسرت نے تابڑ توڑ کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔

منٹو خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا "مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے؟ ہم نے اور بہت کچھ پڑھا ہے۔"

بات شاید کچھ بڑھ جاتی، مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر موضوع ہی بدل دیا۔

اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھونچال سا آ گیا۔ منٹو کا جوابی حملہ شروع ہو گیا "کیوں مولانا، آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے؟ مگر آپ نے کیا پڑھی ہو گی، وہ تو انگریزی میں ہے۔ اور فلاں کتاب؟ شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سُنا ہو گا۔" اور منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لئے اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کا نام مشہور ہو۔ منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوا دیے اور مولانا سے کہلوا لیا کہ اِن میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سُبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

Scanned with CamScanner

منٹو نے کہا:" مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے۔ آپ میں کوئی سُرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجیے۔"

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا:" یار تُو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد کر لئے ؟"

منٹو نے مُسکرا کر کہا:" کل شام یہاں سے اُٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینا کے ہاں گیا تھا۔ جدید ترین مطبوعات کی فہرست اُس سے لے کر میں نے رٹ ڈالی۔"

سُنا کہ اس بدمزگی کو یوں دُور کیا گیا کہ احباب نے رات کو ایک COCK TAIL پارٹی برپا کی، اور جب چند دَور ہو گئے تو منٹو اور حسرت کو گلے ملوا دیا۔

منٹو نے کہا:" مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔"

حسرت نے کہا" نہیں تم ہاہم ہو۔"

منٹو نے کہا" تم ابنِ خلدون ہو۔"

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری توہین کر رہا ہے مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات رکھنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کام کے لئے اوپندر ناتھ اشک بنا تھا۔ بڑی گھُنّی طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو مہینے میں تیس چالیس ڈرامے اور فیچر لکھ دیتا تھا، اور اشک صرف دو ڈرامے لکھتا تھا، اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتا پھرتا تھا کہ جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اُس سے زیادہ کے یہ دو ڈرامے میں نے لکھے ہیں۔ منٹو اس کی بڑی دُرگت بناتا تھا۔ سب کے سامنے اسے فراڈ اور حرام زادہ تک کہہ دیتا تھا۔ اشک اُس وقت تو رُونکھا ہو جاتا لیکن منٹو کی باتیں دل میں رکھتا گیا، اور بعد میں بمبئی کی فلم انڈسٹری میں منٹو کی جڑ کاٹتا پھرا۔

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں۔ اور شیخی کِرکِری کرنے میں اُسے لطف آتا

آتا تھا۔ ن۔م۔ راشد سے میں نے کہا: "یہ آپ کی چھوٹی بڑی شاعری مجھے تو اچھی نہیں لگتی۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟"

راشد نے RYTHYM اور RHYME پر ایک مختصر لیکچر جھاڑنے کے بعد اپنی نظم "اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے" مجھے سنانی شروع کی اور کہا "دیکھیے! میں نے اس نظم میں ڈانس کا ردم رکھا ہے۔"

میں بڑی سعادت مندی سے سنتا رہا مگر منٹو بھلا کب تاب لا سکتے تھے۔ چیخ کر بولے "کونسا ڈانس؟ والز، رمبا، سمبا، کتھا کلی، کتھک، منی پوری؟ ــــ فراڈ کہیں کا۔"

بچارے راشد کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔

منٹو کے دماغ میں نئی سے نئی بات آتی تھی۔ ایسی اپج کسی اور میں دیکھی ہی نہیں۔ ایک میم صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے: "اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوا لوں۔"

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بے زار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "خیریت تو ہے؟" بولے "سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ۔ ٹیلی فون Receive کر کے کہتا ہوں "منٹو" تو ادھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے "ون ٹو؟" میں کہتا ہوں "ون ٹو نہیں 'منٹو'۔" تو وہ کہتا ہے "منٹو؟"

منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا، اور واقعی میں منٹو بہت صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حلیہ لکھنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر جھرّیں کر دیا۔ جب افسانہ ساقی میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اچھل پڑے۔ بولے "میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اصل لفظ یہی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا" اس کے بعد کھلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے

Scanned with CamScanner

کہا کرتے ہیں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں۔ آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

منٹو بظاہر بڑا اکھڑ اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے پہلو میں ایک بڑا حساس دل تھا۔ دُنیا نے اسے بڑے دکھ پہونچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا۔ بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست احباب، کنبہ دار، رشتہ دار، سب سے اسے تکلیفیں پہونچی تھیں۔ اس لئے اُس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا، مگر اس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی۔ منٹو کا گل گوتھنا سا بچہ اچھا خاصا کھیلتا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہونچا، احتیاطاً سو روپے ساتھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو۔ صفیہ کا روتے روتے بُرا حال ہو گیا تھا۔ موت کا گھر تھا، اس لئے میری بیوی کھانا لے کر پہونچیں۔ انہوں نے صفیہ کو سنبھالا۔ منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے۔ بچہ دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے منٹو کو رسمی دلاسا دیا اور چپکے سے روپے اُن کی طرف بڑھا دیئے۔ منٹو نے روپے نہیں لئے، مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا مُنہ تکتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اکثر احباب سے کیا، اور متعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلّی رہے اُن کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی۔ بمبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسہ بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا، اس لئے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کون سی اچھی تھی۔ رہی سہی شراب نے غارت کر دی۔ کئی دفعہ مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے، بیس روپے روز انہیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے اچھا بُرا سب کچھ لکھ ڈالا۔ روزانہ دو ایک افسانے لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ انہیں دے کر وہ کسی

Scanned with CamScanner

ناشر کے پاس پہونچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خریدا۔ پھر بے ضرورت۔ پھر اُکتانے اور منہ چھپانے لگے۔ دور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی، اور میراجی کی۔ بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہونچتا تھا۔ شراب سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرا لیا۔ منہ سے یہ کافر چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر پلا لائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کی قے ہوئی۔ ہسپتال پہونچایا گیا۔ مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست سنہ ۱۹۵۴ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب، شاعر، اڈیٹر اور پبلشر ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ اُن کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا: "آپ تو بہت بیمار ہیں۔ آپ کیوں آئے؟ میں یہاں سے اٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

بولے "ہاں بیمار تو ہوں، مگر جب یہ سنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا۔"

اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی "ادے ادھر آ۔" وہ رُکتا جھجکتا آ گیا: "کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال۔" اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے: "حرام زادے دس روپے تو دے۔" یہ کہہ کر اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پبلشر نے بھی سوچا کہ چلو سستے چھوٹے، وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ بیس منٹ تک بیٹھے۔ باتیں کرتے رہے۔ مگر اُن کی بے چینی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پانچ مہینے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے

پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مرگئے۔ ہمیں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی، خود منٹو کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوحِ مزار کے لئے خود لکھا تھا اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟"

---

rekhta

Scanned with CamScanner

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہدِ قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہ سواری، تیراندازی اور راست بازی۔ شہ سواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ راست بازی کِن کِن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آکر ان کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا، تو یہ اس چوٹ سے اُس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں، جو اِس مشتِ خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوجاتا ہے کہ اگر قبولے، تو مرنا پڑتا ہے؛ ناچار مُکرنا پڑتا ہے، کبھی ابا فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے، جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ کمر دد غا ان کی چاٹ لگاتی ہے، اور جُزدی جُزدی خطائیں ہوجاتی ہیں جن سے مُکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں، کیوں کہ خوشامد جس کی دُکان میں آج موتی برس رہے ہیں، اُس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا اور کون ایسا ہے جو اس قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار اُمید کا بھوکا آقا کو خوش کرکے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے

Scanned with CamScanner

دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں، نہ ڈرپوک ہیں۔ انھیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمود دیے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ[1] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں، تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے، غرض چار ناچار کبھی ان کے ساتھ ساتھ، کبھی پیچھے پیچھے؛ دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دور دور تک پھیل گئی ہے، بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی اور خود اس مُردار سے متنفر ہیں، وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے، مگر پھر بھی لوگ اُسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برخلاف ہوتا ہے، تو اُس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا، اس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی، اس کا ذکر بھی نہیں سنتے، اس کان سنتے ہیں، اُس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع واقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کیں ہیں، تاکہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکۂ صداقت زمانی، سلطانِ آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکۂ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکۂ موصوفہ نے ہوش سنبھالا، تو اوّل تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا، تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے

---

[1] ایک قسم کا شکاری کُتا ہے، جسے ہندوستانی زبان میں گلڈانک کہتے ہیں۔

آراستہ دیکھ کر سب نے صدقِ دل سے تعریف کی۔ عزّتِ دوام کا تاجِ مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالمِ سفلی میں دروغ دیوزاد ایک شعلۂ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اُسے ملبوسِ خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اٹھے، تو چونکہ بزرگانِ آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی، سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں اُن کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و قوت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی؛ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں، آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پری پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے، شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال کا رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھاتا تھا، دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا، تو انسان کیا، فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا، ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا، و ضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں اور چوں کہ یہ ان کی مدد کا محتاج

Scanned with CamScanner

تھا، اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح اُن کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ، بے اوسان تھے، کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا، مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالتے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونو کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیو زاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پہ بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف وگزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ، پیچھے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا، مگر وہ بھی بادِ ہوائی، اٹکل پچو، بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا، کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا، تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی، مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا۔ اور رعبِ خداداد کا خود سر پہ دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی، تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک، بے حیائی کی ڈھال مُنہ پہ لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا۔ اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی۔ مگر سانچ کو آنچ نہیں، زخم جلد بھر آتے تھے۔ اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا، تو اسے سڑتے تھے کہ اوروں میں

Scanned with CamScanner

بھی دبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربہ میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھیروں۔ اس لیے دھوکہ بازی اور شبہہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو[1]، مگر اس طرح کے اینچ پینچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہِ صداقت جو خطِ مستقیم میں ہے، اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اُس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اسی رستہ سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا، اور جدھر سے چاہتا تھا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اُس نے ساری دنیا پر حملے کرنا شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا، ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس سے جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پانو کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے مُنہ پھیرا، اُدھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی، تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سنیں گے اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی مگر بہت تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف ہٹی اور پھر بدعملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا،

---

[1] جب جھوٹ کی قلعی کھلنے لگتی ہے، تو جھوٹا آدمی ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے لوگ شبہہ اور شک میں پڑ جائیں اور سمجھیں کہ ہو تو سکتا ہے، شاید جو یہ کہتا ہے وہی سچ ہو۔

دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہرچند ملکۂ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیوں کہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا، مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوا مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی، تو گھٹتی تھی اور دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا امید ہوئی، تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں، ان ہی میں رہا کریں، اپنے کیے کی سزا آپ پالیں گے۔

سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا، مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا، تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بداصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اُسی وقت عالَمِ بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی۔ اُس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں فرمائی دنیا میں ہر دل عزیز نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اس کے آئینِ حکومت کو جلد اہلِ عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدرِ انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہیں، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاحِ وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے، اپنی سختی اور

Scanned with CamScanner

تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا، لوگ اُس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے خلاف ہے۔ اوّل تو اُس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انھیں سوا عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے، وہی روپ بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہلِ انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کی طرزِ لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحتِ زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیبِ بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ اِدھر اس کا دخل ہوا، اُدھر اِدراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامہ کے اُترتے ہی اُس کی اصل روشنی اور ذاتی حُسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔ چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے، تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیلِ لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔